چند قرآنی الفاظ کی لغوی تشریح

شیخ عنایت اللہ

لسانی تحقیق و تدقیق ہمیشہ سے اہل اسلام کی علمی زندگی کی ایک نمایاں خصوصیت رہی ہے۔ مسلمان اقوام میں سے عربوں نے بالخصوص اپنی زبان کے ساتھ جو اعتناء کیا ہے اور لسانی تحقیقات میں جو سرگرمی دکھائی ہے، اس کی مثال دیگر قوموں کی تاریخ میں بہت کم ملتی ہے۔ اس لسانی تحقیقات میں جو سرگرمی دکھائی ہے، اس کی مثال دیگر قوموں کی تاریخ میں بہت کم ملتی ہے۔ اس لسانی کدوکاوش کی ابتداء قرآن مجید کے مطالعہ سے ہوئی۔ مسلمانوں کو اور خصوصاً عجمیوں کو جب کلامِ پاک کے فہم و تفہیم کی ضرورت پیش آئی تو اس سے لسانی مسائل کی تحقیق کو تحریک ملی۔ زبان کے قواعد منضبط ہوئے، جس سے عربی کا علم صرف و نحو وجود میں آیا۔ از روئے انصاف اس بات کا اعتراف لازمی ہے کہ اِن تحقیقات میں عرب علماء کے ساتھ ساتھ عجم کے فضلاء نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ چنانچہ عربی گرائمر کی سب سے پہلی جامع کتاب جو لکھی گئی وہ ایرانی نسل کے ایک عالم سِیبَوَیہ کے قلم سے نکلی تھی۔ اسی طرح ترکستان کی خاک سے علامہ زمخشری جیسا عربی زبان کا بے نظیر عالِم متبحّر پیدا ہوا۔

عربی گرائمر کی تدوین کے ساتھ ساتھ عربی الفاظ اور محاورات کی جمع و تدوین بھی شروع ہوئی۔ ابتداء میں متفرق مضامین پر چھوٹے چھوٹے رسالے لکھے گئے، مثلاً کتاب الابل، کتاب الخیل اور کتاب الشجر وغیرہ۔ بعدازاں اسی مواد کو بڑے بڑے ضخیم لغات کی صورت میں ترتیب دیا گیا۔ ان کتب لغت کی جامعیت اور وسعت حیرت انگیز ہے۔ جب "لسان العرب" شائع ہوئی تو اس کی سمائی بمشکل بیس جلدوں میں ہو سکی۔ اسی طرح قاموس کی شرح

"تاج العروس" بڑی تقطیع کی دس ضخیم جلدوں میں طبع ہوئی۔ عبرانی، یونانی اور لاطینی بھی علمی زبانیں ہیں، لیکن ان میں سے کسی زبان کو ایسے مفصل اور مبسوط لغات نصیب نہیں ہوئے تھے عربی کتب لغت کی حیرت انگیز جامعیت اور ضخامت کی وجہ عربی زبان کی بے پایاں وسعت ہے، جس پر عبور حاصل کرنا ایک معمولی انسان کا کام نہیں۔ امام سیوطی نے "اتقان" میں ایک فقیہ کا قول نقل کیا ہے کہ کلام العرب لا یحیط بہ الا نبیؑ۔ یعنی عربوں کی زبان اتنی وسیع ہے کہ اس کا احاطہ ایک نبی جیسا غیر معمولی انسان ہی کر سکتا ہے۔ اسی مفہوم کو امام شافعیؒ نے قدرے وضاحت کے ساتھ اپنے "رسالہ" کی ابتداء میں یوں ادا کیا ہے کہ "لسانُ العرب اوسع الالسنۃ مذھباً واکثرھا الفاظاً ولا نعلمُ انّہٗ یُحیطُ بجمیع علمہٖ انسانٌ غیرُ نبیٍّ۔" یعنی عربوں کی زبان تمام زبانوں سے زیادہ وسیع ہے اور اس کے الفاظ بھی مقابلتاً زیادہ ہیں، اور ہمیں معلوم نہیں کہ کوئی انسان سوائے ایک نبی (جیسے عبقری) کے اس تمام علم کا احاطہ کر سکتا ہے۔[1]

عربی زبان کا ظرف بہت وسیع ہے۔ اس نے غیر زبانوں کے سینکڑوں الفاظ معرّب کر کے یعنی اپنے قالب میں ڈھال کر اپنے دامن میں سمیٹ لئے ہیں۔ اس قسم کے متعدد الفاظ قرآن مجید میں بھی آئے ہیں۔ مقالہ ہذا میں اسی قسم کے چند کلمات کی تشریح مقصود ہے، اور یہ تشریح ان کی لغوی تدقیق اور ان کے اصلی مآخذ کی تحقیق تک محدود ہے۔

اس تشریح سے پہلے اس مسئلہ پر بھی گفتگو کرنا ضروری ہے کہ آیا قرآن شریف میں عجمی کلمات پائے جاتے ہیں، یا وہ "عربی مبین" ہونے کی حیثیت سے غیر زبانوں کے الفاظ سے بالکل پاک ہے۔ اس مسئلہ پر ائمۂ اسلام دو گروہوں میں منقسم ہیں، اور انھوں نے اپنی اپنی رائے کے حق میں بہت سے دلائل دیئے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ، عکرمہ اور مجاہد اس بات کے قائل تھے کہ قرآن پاک میں عجمی زبانوں کے الفاظ پائے جاتے ہیں اور انھوں نے متعدد الفاظ مثلاً سِجّیل، مشکوٰۃ اور یَمّ کے متعلق تصریح کی ہے کہ یہ عجمی ہیں۔ بعض دیگر مفسرین بھی اس بات

---

[1] الرسالۃ للامام الشافعی، مطبوعہ قاہرہ، صفحہ ۱۳

میں کچھ مضائقہ نہیں سمجھتے کہ قرآن میں عجمی الفاظ کے وجود کا اعتراف کریں۔ کیونکہ ان کی یہ رائے ہے کہ جو عجمی الفاظ معرّب بن جائیں اور عربی قالب میں ڈھال لئے جائیں ان کا استعمال مخلِ فصاحت نہیں ہو سکتا، کیونکہ وہ عسیر الفہم نہیں رہتے بلکہ قریب الفہم بن جاتے ہیں۔

لیکن اس قول کے برعکس بہت سے ائمہ مثلاً امام شافعیؒ، امام ابن جریر طبریؒ، ابوعبیدہ مَعمر بن مثنیٰؒ، قاضی ابوبکر باقلّانی اور ابن فارس قزوینی (متوفی ۳۹۵ھ) قرآن پاک میں عجمی کلمات کے منکر ہیں۔ ان کی بڑی دلیل یہ ہے کہ قرآن حکیم نے کئی مرتبہ کہا ہے کہ اس کی زبان "عربیٌ مبین" ہے، اور وہ ایسی واضح زبان میں نازل ہوا ہے جس کو عرب لوگ آسانی سے سمجھ سکتے ہیں اس سلسلہ میں وہ اس آیت کا حوالہ دیتے ہیں: وَلَوْ جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا أَعْجَمِيًّا لَقَالُوا لَوْلَا فُصِّلَتْ آيَاتُهُ أَأَعْجَمِيٌّ وَعَرَبِيٌّ۔ اس کے علاوہ خداوند کریم فرماتا ہے: مَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ

ان کے دیگر ہم خیال علماء نے بھی یہ دلیل پیش کی ہے کہ قرآن میں عجمی الفاظ کے وجود کو تسلیم کرنے سے عربی زبان پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ وہ ناقص اور نامکمل ہے اور آسمانی پیغام کے ادا کرنے سے قاصر ہے، حالانکہ خدا تعالیٰ نے اپنے پیغام کے لئے ایسی زبان اختیار کی جو سب زبانوں سے اکمل ہے اور ادائے مطلب کے لئے نَبطی، فارسی اور سُریانی زبانوں کی محتاج نہیں ہے۔ ابن فارس نے لکھا ہے کہ "اگر قرآن میں غیر عربی الفاظ آئے ہیں تو اس سے یہ شبہہ پیدا ہوگا کہ عربی دیگر زبانوں نے مقابلہ میں نامکمل ہے۔"[1]

امام طبریؒ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ قرآن کے بعض الفاظ کی تفسیر میں جو یہ کہا گیا ہے کہ ابن عباسؓ اور دوسرے مفسروں نے بعض الفاظ کو فارسی اور بعض کو حَبشی یا نَبطی بتایا ہے تو دراصل یہ الفاظ کا توارُد اور توافُق ہے۔ یعنی عربوں، ایرانیوں اور حبشیوں نے یکساں الفاظ کو اتفاقاً استعمال کیا ہے۔ لیکن امام ممدوح کی یہ توجیہ تسلی بخش نہیں ہے کیونکہ سینکڑوں الفاظ کے متعلق متعدد قوموں کا توارُد تجربہ اور قیاس کے خلاف ہے۔

---

[1] بحوالہ الاتقان للسیوطی، جلد اوّل صفحہ ۳۱۵

ابومنصور الثعالبی (متوفی ۴۲۹ھ) نے کتاب الجواہر میں اس مسئلہ کو یہ کہہ کر سلجھانے کی کوشش کی ہے کہ "قرآن مجید "مبین" یعنی صاف اور واضح زبان میں نازل ہوا ہے اور اس میں کوئی لفظ ایسا نہیں جو عربی نہ ہو، یا جسے کسی غیر زبان کی مدد کے بغیر سمجھا نہ جا سکے۔ قدیم عربوں کے شام اور حبشہ کے ملکوں کے ساتھ تجارتی تعلقات قائم تھے اور وہ ان ملکوں کا سفر کیا کرتے تھے۔ انھوں نے عجمی کلمات اخذ کر لئے، لیکن ان میں کچھ تبدیلیاں کر دیں۔ مثلاً بعض حروف کو گرا دیا اور بعض عجمی الفاظ میں جو ثقافت تھی، اسے دُور کیا اور پھر ان الفاظ کو اپنی شاعری اور گفتگو میں استعمال کیا۔ چنانچہ اس طرح سے وہ الفاظ خالص عربی الفاظ کی مثل بن گئے اور ان کے لٹریچر کے علاوہ قرآن میں بھی استعمال ہوئے، لہٰذا حقیقت یہ ہے کہ یہ الفاظ پہلے عجمی تھے، لیکن جب عربوں نے ان سے کام لیا اور ان کو معرّب بنا لیا، تو وہ الفاظ اس لحاظ سے عربی بن گئے۔"[1]

امام جلال الدین سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ) نے بھی تقریباً اسی رائے کا اظہار کیا ہے، اور "اتقان" میں اس بحث کو ان الفاظ کے ساتھ ختم کیا ہے کہ "میرے نزدیک صحیح رائے وہ ہے جس سے دونوں قولوں کی تصدیق ہوتی ہے۔ یہ الفاظ اپنی اصل کے لحاظ سے عجمی ہیں لیکن جب وہ عربوں کے استعمال میں آئے اور انھوں نے ان کو معرّب بنا لیا اور ان کو تبدیل کر کے اپنے الفاظ کی صورت دے دی تو وہ الفاظ عربی بن گئے، اور جب قرآن نازل ہوا تو یہ الفاظ عربوں کے کلام میں مختلط ہو چکے تھے، لہٰذا جو شخص یہ بات کہے کہ یہ الفاظ اپنی موجودہ معرّب صورت میں عربی ہیں، تو وہ بھی سچا ہے اور جو شخص یہ کہے کہ وہ الفاظ اپنے اصل مآخذ کے لحاظ سے عجمی ہیں تو وہ بھی سچا ہے۔"[2]

---

[1] علماء لغت کی اصطلاح میں معرّب کسی عجمی زبان کا وہ کلمہ ہے، جسے عربی میں اختیار کرتے وقت حروف کی کمی بیشی یا تبدیلی کے بعد عربی قالب میں ڈھال لیا جائے اور اسے عربی الفاظ کی سی شکل و صورت دے دی جائے۔

[2] الاتقان فی علوم القرآن۔ فصل فیما وقع بغیر لغۃ العرب۔

ابو منصور جوالیقی (متوفی ۵۳۹ھ) اور ابن الجوزی بغدادی (متوفی ۵۹۸ھ) اور دیگر علماء کے اقوال بھی اسی قول کے قریب قریب ہیں۔

اب ہم ناظرین کرام کی خدمت میں چند ایک ایسے قرآنی الفاظ کی لغوی تشریح پیش کرتے ہیں، جن کے متعلق اکثر محققین کی رائے ہے کہ وہ اپنے اصلی مآخذ کے لحاظ سے عجمی ہیں، لیکن معرّب بننے کے بعد عربی زبان کا جزء بن گئے ہیں، اور قرآن پاک نے ان کو جس بے تکلفی سے استعمال کیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول مقبول (صلعم) کے اولین مخاطب ان کے مفہوم و معنی سے بخوبی واقف تھے۔ اور ان کا استعمال قرآن پاک کی زبان کے "مُبین" ہونے میں کسی طرح حارج و حائل نہ تھا۔

انجیل :- قرآن مجید کی رُو سے انجیل وہ آسمانی کتاب ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کو عطاء فرمائی تھی۔ انجیل کا لفظ قرآن پاک کی چھ مختلف سورتوں میں بارہ مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ سورۃ المائدہ میں انجیل کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے: وقفّینا علیٰ آثارھم بعیسَی ابنِ مریم مُصدّقاً لِما بین یدَیہِ منَ التورٰۃِ وآتینٰہُ الانجیلَ فِیہِ ھُدًی ونُور ہ یعنی ہم نے اُن (انبیاء) کے بعد قدم بقدم عیسیٰ فرزند مریم کو بھیجا، جس نے پیش نظر تورات کی تصدیق کی اور ہم نے اسے انجیل دی، اس میں ہدایت اور روشنی ہے۔ قرآن پاک کے باقی مقامات میں بھی جہاں کہیں انجیل کا ذکر آیا ہے، اسی طور پر ایک الہامی کتاب کی حیثیت سے آیا ہے۔

لیکن جو انجیل آجکل عیسائیوں کے ہاں متداول ہے، وہ ایک انجیل نہیں بلکہ چار الگ الگ کتابیں ہیں، جن میں سے ہر ایک انجیل کہلاتی ہے اور اپنے مؤلف کی طرف منسوب ہے۔ ان اناجیل اربعہ کو متّی، مرقس، لُوقا اور یُوحنّا نے (علماء مغرب کی تحقیق کے مطابق) حضرت مسیحؑ کے تقریباً ایک سو سال بعد تالیف کیا تھا۔ ان میں حضرت عیسیٰؑ کی زندگی کے چند متفرق واقعات اور ان کے معجزات و کرامات کا ذکر آیا ہے، اور ان کے علاوہ ان کی تعلیم و تلقین بھی شامل ہے جو بیشتر وعظ و نصیحت کی صورت میں ہے اور جس میں پہاڑی والے وعظ کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

لعض عرب علماء نے انجیل کو عربی قرار دیا ہے، اور اسے مادہ "نجل" سے مشتق کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن قاضی بیضاوی نے اس قول کو قبول نہیں کیا۔ ابو منصور جوالیقی اور شہاب الدین احمد خفاجی نے بھی انجیل کو معرّب بتایا ہے، لیکن انھوں نے اس عجمی لفظ کی نشاندہی نہیں کی، جس کی تعریب کی گئی ہے۔ ابو السعادات ابن الاثیر جزری نے النہایۃ فی غریب الحدیث والاثر میں لکھا ہے کہ یہ کلمہ عبرانی ہے یا سریانی یا عربی۔ علامہ زبیدی صاحبِ تاج العروس نے بھی علماء لغت کے اس اختلاف کا ذکر کیا ہے کہ بعض لوگ انجیل کو عبرانی کہتے ہیں، بعض سریانی اور بعض عربی، لیکن انھوں نے اس بارے میں خود کوئی قطعی بات نہیں کہی۔ علماء لغت کے نزدیک قول راجح یہی معلوم ہوتا ہے کہ انجیل کسی غیر زبان کا لفظ ہے جسے معرّب کر لیا گیا ہے لیکن وہ یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ لفظ کس زبان سے آیا ہے اور اس کی اصلی صورت کیا تھی۔

لفظ "انجیل" کے بارے میں مغربی علماء کی تحقیق یہ ہے کہ یہ دراصل یونانی کلمہ EUAGGELION ہے، جو عبرانی یا آرامی کے توسط سے عربی میں آیا ہے۔ اس کے لغوی معنے بشارت ہیں اور یہ حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم اور ان کے پیغام کے لئے استعمال ہوا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل حسب ذیل ہے :-

مروّجہ اناجیل کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اپنے پیغام کو آسمانی بشارت کہتے تھے، جیسے انھوں نے الخلیل اور فلسطین کے دیگر شہروں اور قریوں میں چل پھر کر سنایا اور اپنے حواریوں سے بھی کہا کہ جاؤ اور لوگوں کو خوشخبری دو کہ آسمانی بادشاہت کا وقت قریب آ پہنچا ہے۔ لوقا کی انجیل (باب چہارم) میں لکھا ہے کہ ایک دن حضرت عیسیٰؑ شہر ناصرہ میں یہودیوں کی عبادت گاہ میں گئے اور اِشَعیا نبی کی کتاب کھول کر یہ عبارت پڑھی کہ "خدا کی روح مجھ پر غالب ہے، کیونکہ اُس نے مجھ کو مسح کیا ہے تاکہ میں مساکین کو یہ بشارت سناؤں کہ اس نے مجھے اس لئے بھیجا ہے کہ میں دل شکستہ لوگوں کو شفاء دوں، اسیروں کی آزادی کی منادی کروں، جو اندھے ہیں ان کو بینائی عطا کروں، اور جو مظلوم ہیں ان کو آزاد کروں"۔

چونکہ حضرت مسیحؑ نے اپنی تعلیم اور اپنے پیغام کو بشارت سے تعبیر کیا ہے، اس لئے وہ کتاب بھی

جس میں ان کی سیرۃ اور ان کی تعلیم مدوّن اور محفوظ ہوئی، انجیل یعنی بشارت کہلائی۔

اس موقع پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اور ان کے اہل وطن کی زبان آرامی تھی پھر ان کے پیغام کے لئے ایک یونانی لفظ کیوں مروّج ہوا۔ اس کی توجیہ یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ کے زمانے میں فلسطین اور مشرق وسطیٰ کے اکثر ملکوں میں کئی صدیوں سے یونانی ایک علمی زبان کی حیثیت سے رائج چلی آرہی تھی، اگرچہ قدیم یونانی قوم کی حکومت زوال پذیر ہو چکی تھی لیکن ان کے علوم کا سکّہ جاری تھا اور ان کی زبان کا علمی تسلط بہت سے ملکوں پر ہنوز قائم تھا۔ لہذا حضرت مسیحؑ کے حواریوں اور مبلّغوں نے اپنے دین کی اشاعت کے لئے اسی عالمگیر علمی زبان سے کام لیا۔ چنانچہ اناجیل اربعہ جن میں حضرت مسیحؑ کے حالاتِ زندگی اور عقائد مندرج تھے، یونانی ہی میں لکھی گئیں، اور چونکہ حضرت مسیحؑ نے اپنے پیغام کو بار بار بشارت کہا تھا اس لئے وہ انجیل کے نام سے موسوم ہوئیں جس کے معنی خوشخبری کے ہیں۔

انگریزی زبان میں انجیل کے لئے گاسپل (GOSPEL) کا جو لفظ مستعمل ہے، اس کے معنے بھی بشارت ہیں۔ گاسپل گویا انجیل کا لفظی ترجمہ ہے۔

انگریزی لفظ EVANGEL بھی مذکورہ بالا یونانی کلمہ سے ماخوذ ہے۔ چنانچہ اناجیل اربعہ کے مؤلفین FOUR EVANGELISTS کہلاتے ہیں۔

جبریل :- یہ نام عبرانی ہے جو "جبر" اور "ایل" سے مرکب ہے۔ جبر بمعنی جبروت یعنی قوّت وطاقت اور ایل بمعنی اللہ۔ لہذا جبریل کے معنے ہوئے قدرتِ خدا یا قدرت اللہ۔

جبریل کا لفظ تورات میں نہیں آیا، مگر صحیفۂ دانیال میں جبریل کا ذکر آیا ہے۔ دانیال نبی ایک رُؤیا کا ذکر کرتا ہے۔ (دانیال ۸/۱۶) "کہ ایک غیبی آواز سنی جو جبریل کو مخاطب کرکے کہتی تھی کہ دانیال کو اس رؤیا کی تعبیر بتا دے۔"

متّی کی انجیل (باب اوّل) میں بھی جبریل کا ذکر آیا ہے۔ جبریل حضرت ذکریا کو یحییٰ کی پیدائش اور حضرت مریمؑ کو عیسیٰؑ کی ولادت کی بشارت دیتا ہے۔

جہاں تک قرآن مجید کا تعلق ہے، جبریل کا لفظ صرف دو تین مرتبہ آیا ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے: قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ

مُصَدِّقاً لِّمَا بَیْنَ یَدَیْہِ وَھُدًی وَّبُشْرٰی لِلْمُؤْمِنِیْنَ ○ مَنْ کَانَ عَدُوًّا لِّلّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَرُسُلِہٖ وَجِبْرِیْلَ وَمِیْکٰلَ فَاِنَّ اللّٰہَ عَدُوٌّ لِّلْکٰفِرِیْنَ ○

پھر سورۃ التحریم میں یوں آیا ہے: ان تتوبا اِلَی اللّٰہِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُکُمَا وَاِنْ تَظٰھَرَا عَلَیْہِ فَاِنَّ اللّٰہَ ھُوَ مَوْلٰہُ وَجِبْرِیْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ بَعْدَ ذٰلِکَ ظَھِیْرٌ ○

جِزْیَہ :- جزیہ وہ ٹیکس ہے جو اسلامی حکومت ذِمّیوں یعنی اپنی غیر مسلم رعایا پر ان کی حفاظت کے بدلے میں عائد کرتی تھی۔

جزیہ کا لفظ قرآن مجید (سورہ براءۃ) میں صرف ایک مرتبہ آیا ہے: قَاتِلُوا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَلَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا یُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَلَا یَدِیْنُوْنَ دِیْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَۃَ عَنْ یَّدٍ وَّھُمْ صٰغِرُوْنَ۔

(ترجمہ) "ان لوگوں سے جنگ کرو جو نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ یوم آخرت پر اور نہ اس چیز کو حرام سمجھتے ہیں جسے اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا ہے اور نہ وہ دین حق کی پیروی کرتے ہیں ان لوگوں میں سے جن کو کتاب دی گئی ہے یہاں تک کہ وہ مطیع ہو کر جزیہ ادا کریں۔"

امام راغب اصفہانی نے مفردات القرآن میں جزیہ کو جزی سے مشتق بتایا ہے اور لکھا ہے کہ اسے جزیہ اس لئے کہتے تھے کہ وہ ذمّیوں پر ان کے جان و مال کی حفاظت کے بدلے میں لگایا جاتا تھا۔ لسان العرب کا بیان بھی اسی کے قریب قریب ہے، غرضکہ جزیہ ان کے نزدیک ایک خالص عربی لفظ ہے۔

لیکن اس کے برخلاف ابوعبداللہ محمد بن احمد الخوارزمی (متوفی ۳۸۷ھ) نے "مفاتیح العلوم" (مطبوعہ لائڈن ۱۸۹۵ء) میں جزیہ کے متعلق لکھا ہے کہ ھو معرّب گزیت وَھُوَ الخراجُ بالفارسیۃِ یعنی جزیہ گزیت کا معرّب ہے اور فارسی زبان میں اس کے معنے خراج کے ہیں۔

علامہ شبلی نعمانی نے اسی قول کو قبول کیا ہے، اور اس کی تائید میں متعدد فارسی لغت

نولیسوں کی تصریحات سے استناد کیا ہے۔ مفصل بحث کے لئے ملاحظہ ہو علامہ موصوف کا رسالہ "الجزیہ" جو "رسائل شبلی" کے علاوہ ان کے مقالات میں بھی دوبارہ چھپ چکا ہے۔

درہم :- درہم چاندی کا ایک چھوٹا سا سکّہ تھا جو ظہورِ اسلام کے وقت ایرانی سلطنت میں رائج تھا اور عراق (مثلاً حیرہ وغیرہ) میں بھی چلتا تھا، جو اس زمانے میں کسریٰ کے زیر نگین تھا۔ درہم کا لفظ قدیم عربی شعراء کے کلام میں پایا جاتا ہے اور گمان غالب ہے کہ ایّام جاہلیت کے عرب اس سکّہ سے ایرانیوں ہی کے ذریعے سے واقف ہوئے تھے، کیونکہ ان کے اپنے ملک میں نہ کوئی دار الضرب تھا اور نہ کوئی اپنے مخصوص سکّے تھے، ہمسایہ ملکوں میں جو درہم و دینار جاری تھے، ان ہی سے کام چلاتے تھے۔

درہم کا لفظ بصیغہ جمع (یعنی بصورت دراہم) قرآن مجید میں مستعمل ہوا ہے۔ چنانچہ سورۂ یوسف میں یوں آیا ہے: وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُودَةٍ وَكَانُوا فِيهِ مِنَ الزَّاهِدِينَ ٥ (ترجمہ) "اور انھوں نے اس کو (یعنی یوسفؑ کو) چند درہموں کے بدلے میں سستے داموں بیچ ڈالا اور انھوں نے اس کی کچھ قدر نہ جانی"۔

علماء لغت میں سے کسی نے درہم کو یونانی اور کسی نے پہلوی بتایا ہے۔ یہ دونوں بیان اپنی اپنی جگہ درست ہیں، کیونکہ یہ لفظ اگرچہ اپنی اصل کے لحاظ سے یونانی دراخمہ (DRACHME) ہے مگر عربوں کے ہاں پہلوی کے واسطہ سے براہ ایران آیا ہے۔ اسکندر اعظم کی فتوحات کے بعد یونان اور ایران میں اختلاط بڑھ گیا تھا، چنانچہ اسکندر کے ایک سپہ سالار سلوکس نے ایران میں ایک مستقل خاندان کی بنیاد ڈال دی تھی۔ اندریں حالات گمان غالب یہی ہے کہ درہم پہلے یونانی حکومت کے اثر سے ایران میں رائج ہوا اور پھر وہاں سے عراق اور دیار عرب میں پہنچا۔

درہم کا رواج فتح ایران کے بعد اسلامی عہد میں کئی صدیوں تک قائم رہا، لیکن اب ایک مدّت سے متروک ہو چکا ہے، لیکن اس کے باوجود اپنے اصلی ملک یعنی یونان میں ایک قومی سکّہ کی حیثیت سے آج تک بدستور جاری ہے۔ یہ امر اس بات کا مزید ثبوت ہے کہ اس کی اصل یونان سے ہے۔

یہ یونانی لفظ بعض مغربی زبانوں میں بھی داخل ہو چکا ہے، چنانچہ انگریزی میں DRAM کی صورت میں پایا جاتا ہے، فرانسیسی میں DRAME اور لاطینی میں DRACHMA ہے۔

دِینار :- دینار ایک طلائی سکہ تھا، جو ظہورِ اسلام کے وقت رُومی سلطنت میں رائج تھا۔ زمانہ قبل الاسلام کے عرب رُومی مقبوضات یعنی شام و فلسطین کے ساتھ تجارتی تعلقات رکھتے تھے اس لئے وہ دینار سے بخوبی واقف تھے، چنانچہ دینار کا ذکر قرآن (سورہ آلِ عمران) میں یوں آیا ہے: وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ۝ یعنی "اہل کتاب میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں کہ اگر تم ان کے پاس ایک قنطار امانت رکھ دو، تو وہ اسے واپس ادا کر دیں گے، اور کچھ ایسے بھی ہیں کہ اگر تم ان کے پاس ایک دینار بھی بطور امانت رکھو تو جب تک تم ان کے سر پر کھڑے نہ ہو، تمہیں کبھی واپس نہ دیں۔"

جیساکہ علامہ زَبیدی نے تاج العروس میں لکھا ہے، دینار کے بارے میں اختلاف رائے ہے۔ علماءِ لغت اس بات سے بخوبی آگاہ تھے، کہ دینار ایک عجمی لفظ ہے اور بعض نے اس کے ساتھ یہ بھی ادّعاء کیا ہے کہ فارسی زبان سے لیا گیا ہے۔ ابو منصور جوالیقی نے کتاب المعرّب میں لکھا ہے کہ قیراط اور دیباج کی طرح دینار کی اصل عجمی ہے، لیکن عرب لوگ قدیم زمانے سے ان الفاظ کو بولتے آئے ہیں، اس لئے وہ عربی بن گئے ہیں۔ راغب اصفہانی "معزدات القرآن" میں لکھتے ہیں کہ دینار اصل میں دنّار تھا، اور اس بارے میں ایک اور قول بھی نقل کیا ہے کہ دینار فارسی دین آر کا معرّب ہے یعنی وہ جسے شریعت لائی ہو، لیکن اس قول کا مہمل اور لایعنی ہونا عیاں ہے۔

اس مسئلہ کو سلجھانے کی احسن صورت یہ ہے کہ اس معاملہ پر تاریخی لحاظ سے نگاہ ڈالی جائے اور یہ دریافت کیا جائے کہ یہ سکّہ سب سے پہلے کس قوم یا کس ملک میں جاری ہوا تھا۔ مغربی علماء کی تحقیق یہ ہے کہ دینار لاطینی DENARIUS سے ماخوذ ہے، اور یہ لفظ رومیوں کے ہاں ایک طلائی سکّہ کے لئے مستعمل تھا۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ دینار حضرت مسیحؑ سے دو سو سال پہلے رومہ میں مضروب ہوا تھا اور اس کے بعد رومیوں میں اس کا

استعمال مسلسل جاری رہا۔ جب رومی سلطنت مشرق کی طرف پھیلی تو ان کی حکومت کے ساتھ ساتھ دینار کا رواج بھی مشرقی ملکوں میں پھیلتا گیا، چنانچہ حضرت مسیح کے زمانے میں شام اور فلسطین میں جو رومیوں کے زیرِ نگین تھے، دینار کا عام رواج تھا اور یہ رواج بعد کے زمانے میں بھی جاری رہا۔ ظہورِ اسلام سے پیشتر شام کے ساتھ عربوں کے تجارتی تعلقات قائم تھے، لہٰذا تجارت کے سلسلہ میں ان کا دینار کے ساتھ واقف ہونا ایک یقینی امر ہے، اور قرآن مجید میں دینار کا لفظ جس بے تکلفی سے استعمال ہوا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ ظہورِ اسلام کے وقت دینار عربوں کے ہاں ایک معروف چیز تھی۔

جب عربوں نے رومیوں سے شام اور مصر کے ملک لے لئے، تو ان مفتوحہ ملکوں میں دینار کا رواج بدستور جاری رہا، البتہ ایک اہم تبدیلی یہ ہوئی کہ مسلمان خلفاء نے بالآخر اپنے ہاں دار الضرب قائم کر لئے اور خلیفہ عبدالملک اموی نے سکّوں پر عربی کلمات نقش کرائے۔ دینار کا استعمال جو پہلے رومی مقبوضات تک محدود تھا، اسلامی عہد میں تمام اسلامی سلطنت میں پھیل گیا، اور درہم و دینار کئی صدیوں تک اسلامی ملکوں میں ساتھ ساتھ چلتے رہے۔

زنجبیل :- عربی ہے بمعنے ادرک۔ جب خشک ہو جائے تو اسے ہندی میں سونٹھ کہتے ہیں۔ ادرک ایک پودے کی خوشبودار گٹھیلی جڑ ہے، جو مسالہ کے طور پر کام آتی ہے، ادویہ میں ڈالی جاتی ہے اور اس سے مُربّا بھی تیار کرتے ہیں۔ اگر ادرک کی گرہ کو غور سے دیکھا جائے تو اس پر سینگ کی مثل چھوٹے چھوٹے اُبھار نظر آتے ہیں، غالباً اسی لئے ادرک کو سنسکرت میں شرنگ ویرا (SHRANGVERA) کہتے ہیں، یعنی ایسا "جسد جو سینگوں پر مشتمل" ہے۔

زنجبیل کا لفظ قرآن مجید میں ایک جگہ استعمال ہوا ہے۔ سورۃ الانسان میں جنت کی نعمتوں کے بیان میں اس کا یوں ذکر آیا ہے: وَيُسْقَوْنَ فِيهَا كَأْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيلًا ٥ (ترجمہ) اُن کو (یعنی اہل جنت کو) وہاں ایسا جام پلایا جائے گا جس میں زنجبیل کی آمیزش ہو گی۔"

اکثر لغت نویس اس بات پر متفق ہیں کہ زنجبیل کا لفظ فارسی زبان سے آیا ہے چنانچہ ثعالبی نے فقہ اللغہ میں اور جوالیقی نے کتاب المعرَّب میں اسے ان فارسی الفاظ میں شمار کیا ہے، جن کو معرَّب کر لیا گیا ہے۔ اور ان کے بعد امام سُیوطی اور قاضی خفاجی نے بھی اس قول کو

قبول کر لیا ہے۔

اگر اِس قول کو درست تسلیم کر لیا جائے تو پھر ہمیں اُس کے فارسی مآخذ کے لئے پہلوی کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ پہلوی میں اسے سِنگبیر کہا گیا ہے، اور اس لفظ کا زنجبیل کی صورت میں تبدیل ہو جانا بعید از قیاس نہیں ہے۔

زنجبیل کا استعمال نہایت قدیم ہے۔ یونانی اور رُومی لوگ اسے بحر احمر (یعنی بحر قلزم) کے راستے سے حاصل کرتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ زنجبیل جنوبی عرب کی پیداوار ہے، حالانکہ اس کا حقیقی وطن ہندوستان تھا اور عرب لوگ اسے سیاہ مرچ کے ساتھ ہندوستان کے مغربی ساحل سے حاصل کرتے تھے۔ چونکہ زنجبیل ہندوستان کی خاص پیداوار ہے، اس لئے عہد حاضر کے محققین کی یہ رائے قرار پائی کہ اس کے نام کی اصل ہند کی سرزمین میں تلاش کرنی چاہیئے، لہٰذا اُن کے نزدیک زنجبیل کے جو یونانی اور لاطینی نام ہیں یعنی ZIGGIBER اور ZINGIBER وہ دونوں بالآخر ہندوستان کی کلاسیکی زبان سنسکرت سے ماخوذ ہیں۔ زنجبیل کو سنسکرت میں SHRANG VERA اور پالی میں (جو بلحاظِ زمانہ سنسکرت سے متأخّر ہے) سِنگ ویرا (SINGIVERA) کہتے ہیں۔ یہ پالی نام اس کے پہلوی نام سِنگ بر (SINGABER) سے قریبی مشابہت رکھتا ہے اس لئے یہ بات عین قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ زنجبیل کا پہلوی نام پالی سے ماخوذ ہو۔

زنجبیل کو لاطینی میں ZINGIBER اور فرانسیسی میں GINGEMBRE کہتے ہیں، انگریزی نام GINGER انہی سے ماخوذ ہے [۱]

صِراط :- صراط کا لفظ قرآن مجید میں تقریباً ۴۵ مرتبہ آیا ہے۔ صراط کے لغوی معنے

---

[۱] پروفیسر ALLAN ROSS آجکل برمنگھم یونیورسٹی میں شعبہ لسانیات کے صدر ہیں۔ انھوں نے GINGER کی لسانی اور تاریخی تحقیق میں ایسا کمال دکھایا ہے، اور اس بارے میں ایسے استیعاب اور استقصاء سے کام لیا ہے کہ ان کے احباب نے ان کو ازراہِ ظرافت GINGER ROSS کا نام دے رکھا ہے۔

راستہ کے ہیں لیکن قرآن پاک میں یہ لفظ ایک مذہبی رنگ میں استعمال ہوا ہے، یعنی مستقیم کے ساتھ مل کر "صراطِ مستقیم" کی صورت میں صحیح مذہبی روش کے لئے آیا ہے۔

امام سیوطی نے اتقان میں النقّاش اور ابن الجوزی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ صراط رومی زبان میں راستہ کو کہتے ہیں۔ اور ابو حاتم احمد بن حمدان الرازی (متوفی ۳۲۲ھ) نے بھی اپنی کتاب الزینۃ میں اس کو رومی الفاظ میں شمار کیا ہے[۱] عہد حاضر کے مغربی محققین کی بھی یہی رائے ہے کہ یہ لفظ لاطینی STRATA ہے، جو پہلے شام میں مروج ہوا اور پھر سریانی کے واسطہ سے عربی میں داخل ہوا۔

صراط کا لفظ جاہلی شعراء کے کلام میں بھی پایا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ قدیم زمانے ہی سے عربوں کے استعمال میں آچکا تھا۔

فرعون :- فرعون مصر قدیم کے حکمرانوں کا لقب ہے، جو بنی اسرائیل کے سلسلہ میں تورات اور قرآن دونوں کتابوں میں بکثرت آیا ہے اور قرآن پاک میں چوہتر مرتبہ مذکور ہوا ہے۔

امام طبری اور قاضی بیضاوی سورۂ بقرہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ جس طرح ایرانیوں اور رومیوں کے حکمرانوں کا لقب کسریٰ اور قیصر تھا، اسی عمالقہ کے فرمانروا "فرعون" کے لقب سے پکارے جاتے تھے، سیبویہ اور جوالیقی بھی فرعون کو ایک عجمی کلمہ تسلیم کرتے ہیں[۲]

مغربی فضلاء کی تحقیق یہ ہے کہ قدیم مصری اپنے حکمرانوں کو "پرعو" (PER - O) کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ پرعو کے لفظی معنے "دُودمانِ عالی" ہے، لیکن رواج عام سے اور امتداد زمانہ سے "پرعو" نے ایک اصطلاحی صورت اختیار کر لی اور شاہانِ مصر کا ایک مخصوص لقب بن گیا۔ فرعون کا لفظ اسی مصری کلمہ "پرعو" کی عبرانی صورت ہے، جو عبرانی

---

[۱] کتاب الزینۃ بتصحیح ڈاکٹر حسین ہمدانی مرحوم مطبوعہ قاہرہ ۱۹۵۷ء جزء اوّل (طبع ثانی) صفحہ ۱۳۶ -

[۲] المعرّب من الکلام الاعجمی لابی منصور موہوب بن احمد الجوالیقی البغدادی مطبوعہ لائپزگ ۱۸۶۷ء بتصحیح و تحشیۂ ایڈورڈ زخاو۔

کے توسط سے عربی میں رواج پذیر ہوا۔ تاریخی قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ جب بنی اسرائیل حضرت موسیٰؑ کی قیادت میں مصر سے نکلے تو یہ لفظ اپنے ساتھ لائے، جو بعد ازاں فرعون کی صورت میں تورات میں استعمال ہوا، اور اس کے بعد عربی میں منتقل ہوا۔

عربوں نے اپنے قواعد لسانی کے مطابق فرعون کی جمع فراعنہ بنالی ہے اور اس سے کچھ مشتقات بھی بنائے ہیں مثلاً تَفَرْعُنُ بمعنی رعونت اور تمرّد۔

انگریزی زبان میں فرعون کو PHAROAH لکھتے ہیں۔

فردوس:- عربی کلمہ ہے بمعنے جنّت یا بہشت بریں۔

فردوس کا لفظ قرآن مجید میں مومنوں کی نعمتوں کے ضمن میں دو مرتبہ آیا ہے۔ سورۃ الکہف میں اس کا ذکر یوں آیا ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ۝ یعنی "بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کئے، ان کی مہمانی کے لئے فردوس کے باغات ہیں۔" پھر سورہ المومنون میں ہے کہ اَلَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ یعنی "جو لوگ فردوس کے وارث ہوں گے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔"

علماء لغت مثلاً جوہری مؤلّف صحاح، مجدالدین فیروز آبادی مصنف قاموس اور ابن منظور صاحب لسان العرب تمام اس بات پر متفق ہیں کہ فردوس کے لغوی معنی بُستان یعنی باغ ہیں، لیکن اس کے اصل مآخذ کے متعلق ان میں بہت کچھ اختلافِ رائے پایا جاتا ہے فیروز آبادی اور الخفاجی نے لکھا ہے کہ فردوس ایک عربی لفظ ہے[1] لیکن اس کے برعکس اکثر علماء لغت کی یہ رائے ہے کہ یہ کلمہ عجمی ہے، لیکن اس سوال کے جواب میں کہ یہ لفظ کس زبان سے آیا ہے بہت سے اقوال ہیں۔ عِکرمہ نے اسے حبشی بتایا ہے، لیکن متعدد علماء مثل الثعالبی (فقہ اللغہ) اور الجوالیقی (المعرّب) اس بات کے قائل ہیں کہ یہ لفظ

---

[1] شفاء الغلیل فیما فی کلام العرب من الدخیل تالیف شہاب الدین احمد الخفاجی المصری، صفحہ ۱۶۸ (مطبوعہ قاہرہ، ۱۲۸۲ھ)

یونانی ہے اور امام سیوطی نے اتقان اور مزہر میں اسی قول کو ترجیح دی ہے۔

عہد حاضر کے اکثر محققین کی رائے ہے کہ اگرچہ فردوس کا لفظ یونانی زبان میں پایا جاتا ہے، لیکن اس کی اصل قدیم ایران سے ہے۔ زرتشتیوں کی قدیم ترین مذہبی کتاب اوستا میں یہ لفظ "پیریدیزہ" کی صورت میں پایا گیا ہے۔ مشہور یونانی مورّخ زینوفون (XENOPHON) نے جس کا زمانہ چوتھی صدی قبل مسیح ہے، اس لفظ کو PARADEISOS کی صورت میں شاہانِ ایران کے باغات کے لئے استعمال کیا تھا، چنانچہ اس کے ذریعے سے یہ لفظ یونانی زبان میں رائج ہوا، اور پھر تورات کے اس یونانی ترجمہ (SEPTUAGINT) میں بھی مستعمل ہوا، جو تیسری صدی قبل مسیح میں اسکندریہ میں مصر کے یونانی فرمانروا بطلیموس (PTOLEMY) کے ایماء سے تیار ہوا تھا۔ بعدازاں یہی لفظ یونانی کے توسط سے مشرق و مغرب کی بہت سی زبانوں میں رائج ہو گیا، اور قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ متعدد دیگر یونانی الفاظ کی طرح یہ لفظ بھی سریانی زبان کے راستہ سے عربی میں داخل ہوا۔

فردوس کو انگریزی میں PARADISE اور جرمن میں PARADIES لکھتے ہیں۔ یہ دونوں لفظ یونانی PARADEISOS سے ماخوذ ہیں۔

کافور :- کافور ایک سفید رنگ کا شفاف اور خوشبودار مادہ ہے، جو ایک خاص درخت کی لکڑی سے حاصل ہوتا ہے۔ کافور کا درخت مشرق بعید کی خاص پیداوار ہے جو چین اور جاپان کے علاوہ فارموسا اور بورنیو کے جزیروں میں بھی پایا جاتا ہے۔ کافور کرم کش ہے اور اس کے علاوہ مُسکِّن ہے۔ ان خواص کی وجہ سے ادویّہ اور عطریات میں استعمال ہوتا ہے۔ اور دنیا کی منڈیوں میں ہمیشہ سے اس کی مانگ رہی ہے، اور قرونِ وسطیٰ میں عرب لوگ جن اشیاء کی تجارت کرتے تھے ان میں کافور بھی شامل تھا۔

کافور کا ذکر قرآن مجید (سورۃ الانسان) میں جنت کی نعمتوں کے ضمن میں یوں آیا ہے: اِنَّ الْاَبْرَارَ یَشْرَبُوْنَ مِنْ کَاْسٍ کَانَ مِزَاجُهَا کَافُوْرًا ۝ یعنی نیک لوگ بے شک ایسے جام میں سے پئیں گے جن میں کافور کی آمیزش ہو گی۔

اگرچہ "لسان العرب" کے مؤلف ابن منظور نے کافور کو خالص عربی لفظ بتایا ہے، لیکن

ثعالبی (فقہ اللغہ)، جوالیقی (معرّب)، سیوطی (اتقان) اور خفاجی (شفاء الغلیل) سب نے لکھا ہے کہ کافور فارسی زبان سے ماخوذ ہے۔ پہلوی میں اس لفظ کی صورت "کاپور" تھی۔ اس لئے یہ بات بالکل قرین قیاس ہے کہ کافور اسی پہلوی لفظ "کاپور" کا معرّب ہو۔

مشرق کی دیگر زبانوں میں کافور کے لئے جو الفاظ آئے ہیں، اس بحث کے دوران میں ان کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے، مثلاً کافور کو سنسکرت میں کرپور، ہندی میں کپور اور ملایا اور جاوا کی زبانوں میں "کاپور" کہتے ہیں۔ ان ملکوں کے ساتھ عربوں کے تعلقات بحری راستہ سے قدیم الایام سے قائم ہو چکے تھے، اور عرب مصنفین کا بیان ہے کہ عرب تاجر کافور جاوا اور سماٹرا سے حاصل کرتے تھے، اس لئے اس امر کا بھی قوی امکان ہے کہ عربوں نے کافور کے ساتھ اس کا نام بھی ان ملکوں کی زبان سے براہ راست لیا ہو۔ اور کاپور میں پ کا جو حرف آیا ہے، اسے ف میں تبدیل کر کے کافور بنا لیا ہو۔

☆

ہدیۂ تبریک

ماہ صیام الوداع! غرہ شوال خوش آمدید!! عید کی خوشیاں مبارک!!! رسالہ قارئین کے ہاتھ میں پہنچے گا اس وقت تک ماہِ صیام کب کا رخصت ہو چکا ہوگا۔ شوال کا چاند ہلال سے بدر میں تبدیل ہو رہا ہوگا اور عید کی خوشیاں پرانی ہو گئی ہوں گی۔ تو کیا ہوا۔ جہاں ادا ممکن نہ ہو قضا واجب ہوتی ہے۔